

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں (۳)



جلت خیر میں بھی پسندیدہ نہیں

وقوع قیامت اور اثباتِ آخرت کے ضمن میں منکرین کے اعتراضات، اشکالات اور شبہات کے جواب کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد، اب ہمیں ان چار آیات (۱۶ تا ۱۹) کا مطالعہ کرنا ہے، جن میں خطاب براہ راست نبی اکرم ﷺ سے ہے اور جن میں اولاً آپؐ کو تحصیل قرآن کے ضمن میں فرط شوق و اشتیاق کی بناء پر غلت پسندی سے نہایت شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ متن قرآن کے ضمن میں جمع و ترتیب اور مطالب قرآن کے ضمن میں تفتیش و تدقیق کے لئے آپؐ کو زحمت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے، ان جملہ امور کی کامل ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ تو آئیے کہ پہلے ان آیات مبارکہ کا ایک سلیس و رواں ترجمہ سامنے رکھ لیں اور پھر ان میں سے مقدم الذکر مضمون پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ غور کریں۔

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجَازِلَ بِهِ﴾ ○ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ○

فَإِذَا قَرَأَهُ فَأَتَّبِعْ قُرْآنَهُ ○ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ○ ﴿

”(اے نبیؐ) آپؐ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت مت دیا کیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کریں۔ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس

کا اظہار کرنا۔ پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس پڑھنے کی آپؐ (بھی) پیروی کیجئے۔

پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت بھی!

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کا اسلوب چونکہ خطبہ کا ہے اور خطبہ میں تحویل خطاب ہوتا رہتا ہے کہ ابھی خطیب کسی ایک جانب مخاطب تھا، پھر اس کا خطاب دوسری جانب ہو گیا۔ مزید برآں کبھی وہ حاضر کو غائب فرض کر کے گفتگو کرتا ہے اور کبھی غائب کو حاضر فرض کر کے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس کی ایک نمایاں مثال زیر مطالعہ آیات کی صورت میں موجود ہے۔ اس لئے کہ یہ سورۃ مبارکہ از اول تا آخر مختلف اسالیب سے منکرین قیامت کے ساتھ بحث و گفتگو اور رد و قدح پر مشتمل ہے، لیکن درمیان میں خطاب کا رخ نبی اکرم ﷺ کی جانب مڑ گیا۔ اس ضمن میں یہ بھی سمجھنا ہے کہ اس سورۃ مبارکہ کے اصل مضمون کے ساتھ اس گفتگو کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لئے کہ چاہے کسی سلسلہ کلام میں کوئی بات ضمنی طور پر آئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ کلام کے عمود کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی ربط ضرور ہوتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی ”خفی“ ہو۔ چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں لوگوں کی گمراہی کا ایک اہم اور بنیادی سبب ”حُبِّ عاجلہ“ کو قرار دیا گیا ہے :

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۖ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۖ﴾

”ہرگز نہیں، بلکہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔“

یعنی انسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ ”عاجلہ“ یعنی دنیا سے دل لگا بیٹھتا ہے، اس لئے کہ اسکی لذتیں بھی فی الفور محسوس ہوتی ہیں اور انسان ان سے شاد کام ہوتا ہے اور اسکی کلفتیں اور اذیتیں بھی انسان کو فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ گویا دنیا کا نفع بھی نقد ہے اور نقصان بھی۔ چنانچہ جب یہ ”عاجلہ“ انسان کا اصل مطلوب و مقصود بن جاتی ہے تو اس کائنات اور اسکی تخلیق کے وسیع ترین حقائق اور بلند ترین مقاصد انسان کی نگاہوں سے خود بخود او جھل ہو جاتے ہیں، اور انسان کا شعور ان سے محجوب ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ آخرت کو مختلف غلط تاویلات سے نظر انداز کر دیتا ہے، بلکہ اس پر اعتراضات، اشکالات اور شبہات وارد کرتا ہے، حتیٰ کہ اسے محال مطلق گردانتا ہے اور اس کا انکار کر دیتا ہے۔

یہاں ایک نہایت لطیف لفظی مناسبت سے بات کا رخ حضور اکرم ﷺ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَا تُحَوِّلْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجْعَلَ بِهِ﴾ (اے نبی!) آپ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں کہ قرآن کو جلدی سے یاد کر لیں یا حاصل کر لیں۔ یہاں عجلت کے ذکر سے اس عظیم حقیقت کی جانب اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ ”عجلت پسندی“ وہ چیز ہے جو خیر کے لئے بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ ”سج پکے سو مینھا ہو“ کے مصداق خیر اور نیکی کے کاموں میں بھی مناسب تدریج اور میانہ روی پیش نظر رہنی چاہئے، تب ہی ان میں ممکن و استحکام بھی پیدا ہوتا ہے اور نتائج بھی صحیح اور متوازن طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ الغرض، یہ تو ایک بڑی لطیف معنوی ربط کی بات تھی جس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی طرف خطاب کا رخ مڑ گیا۔

قرآن حکیم اس کو انسان کی طبعی کمزوریوں میں شمار کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ یعنی ”انسان کی خلقت اور سرشت میں جلد بازی کا عنصر شامل ہے“ (آیت ۳۷)۔ یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو سورۃ النساء میں وارد ہوا کہ: ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾ ”انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے“ (آیت ۲۸)۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی خلقت اور سرشت میں بعض پہلو ضعف کے ہیں جن میں سے ایک عجلت پسندی بھی ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ﴿كَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾ ”انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے“ (آیت ۱۱)۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس عجلت پسندی کا رخ شر اور نفس پرستی کی طرف ہو جائے تب تو اس کی تباہ کاری اور ہولناکی اظہار من الشمس ہے ہی، لیکن اگر عجلت پسندی کا رخ خیر کی جانب ہو تب بھی یہ ایک غیر مطلوب اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال سورۃ ط میں آئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے طلب فرمایا تو آن جناب وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا: ﴿وَمَا أَعَجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَا مُوسَى﴾ ”اے موسیٰ! تم وقت مقررہ سے قبل اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آگئے؟“ حضرت موسیٰ نے جواباً عرض کیا: ﴿فَتَنَبَّأْتُ عَلَى النَّحْيِ وَاعَجَلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَى﴾ ”پروردگار! وہ بھی

میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور میرے رب! میں تو تیری طرف جلدی کر کے اس لئے آیا ہوں کہ تو راضی ہو جائے“ (آیات ۸۳، ۸۴)۔ گویا وہ جو ایک مشہور مصرع ہے ”تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ!“ اس میں تھوڑا سا تصرف کر لیجئے کہ ”تو میرا شوق دیکھ، مرا اشتیاق دیکھ!“ یعنی میں تو اے رب! تیری ملاقات کے شوق میں جلدی کر کے پہلے آ گیا ہوں۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوا: ﴿قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ﴾ ”اللہ نے فرمایا: (اے موسیٰ) تمہاری غلت کا نتیجہ یہ نکل چکا ہے کہ ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو فتنہ میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے“ (آیت ۸۵)۔ معلوم ہوا کہ اگرچہ حضرت موسیٰ کی غلت اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور مخاطبہ الہی سے شاد کام ہونے کے اشتیاق پر مبنی تھی، جو سرا سر خیر اور ہر اعتبار سے قابل تعریف جذبہ ہے، لیکن عالم واقعہ میں اس کا بھی ناپسندیدہ نتیجہ ظاہر ہوا۔

اسی سورہ طہ میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ یعنی اے نبی ﷺ آپ کا ذوق و شوق ہمارے علم میں ہے۔ آپ کا یہ اشتیاق اپنی جگہ! لیکن ہم نے نزول قرآن کے لئے ایک ترتیب اور ایک تدریج مقرر کر رکھی ہے۔ ہماری حکمت بالغہ میں اس کا جو بھی وقت معین ہے، اس کا نزول اسی کے مطابق ہو گا۔ رہی علم کی وہ پیاس جو آپ کو اپنے قلب مبارک میں شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے تو اس کے لئے آپ دعا کرتے رہا کیجئے کہ ”اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما“ (آیت ۱۱۴)۔

سورہ مریم میں یہی مضمون اس انداز میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور ﷺ کے شوق و اشتیاق اور وحی کے انتظار کے متعلق حضرت جبریلؑ سے کہلوا یا گیا: ﴿وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا يَنْزِلُ وَأَمْ حُلُفَتَا مَا يَنْزِلُ ذَٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ ”ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے“ اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ اور آپ کا

رب بھولنے والا نہیں ہے!“ (آیت : ۶۳) — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ سے شکوہ کیا ہو گا کہ آپ دیر دیر سے اور وقفہ دے کر آتے ہیں، بندہ ہمیں وحی کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا جواب ہے جو حضرت جبرئیلؑ کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے دلویا کہ ہم اللہ کے حکم سے وحی لے کر آتے ہیں۔ اس کا علم کامل ہے، کائنات کی کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تاخیر و تعویق اس کے کسی نسیان کے باعث نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت بالغہ کے مطابق ہے۔

پھر اسی سورہ مریم میں حضور اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا : ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ﴾ ”انما نَعُدُّ لَهُمْ عَذَابًا“ (پس (اے نبی) آپ ان (کافروں) پر عذاب کے نزول کے لئے جلدی نہ کیجئے۔ بالتحقیق ہم ان کے لئے (دن) گن رہے ہیں“ (آیت : ۸۴)۔ یعنی یہ کفار و مشرکین ہماری گرفت میں ہیں، کہیں بھاگ کر نہیں جاسکیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو کفر کر دار تک پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اس کے لئے بھی ایک مہلت ہمارے علم کامل اور حکمت بالغہ میں معین ہے — اور جیسے سورہ الطارق میں ارشاد فرمایا گیا : ﴿فَمَهْلِ الْكَافِرِينَ أَهْلُهَا﴾ ”پس (اے نبی) ان کافروں کو ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ ان کے لئے جو ذہیل اور مہلت ہم نے مقرر کر رکھی ہے ذرا اسے ختم ہو لینے دیجئے!“ یعنی ہمارے علم کامل میں ہر چیز کا وقت معین ہے۔ اجل مسمیٰ کو کوئی ٹال نہیں سکے گا۔ اور جب وہ وقت معین آجائے گا تو ان کا حساب پاک کر دیا جائے گا۔

الغرض یہاں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اے نبی! آپ قرآن کو یاد کرنے کے لئے جلدی نہ کیا کیجئے اور اس کے لئے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیا کیجئے — اور اس مضمون کو عجلت کی لفظی مناسبت کی بناء پر سورہ القیامہ میں گننے کے مانند جزا دیا گیا کہ عجلت پسندی تو وہ شے ہے جو نیکی اور خیر کے کاموں کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی، کجایہ کہ انسان پر ”حُبِّ عاجلہ“ کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کی ساری جدوجہد، سعی و محنت اور تہمت و دو کا مقصود و مطلوب ہی صرف ”عاجلہ“ یعنی دنیا کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کا حصول بن کر رہ جائے۔ تو اس کے جو خراب نتائج نکلیں گے ان کا تم خود بخوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ اس پورے مفہوم کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں نہایت فصاحت و

بلاغت کے ساتھ ان دو آیات میں سمو دیا گیا۔ یعنی تمہاری تمام تر گمراہی اور ضلالت، اور کفر و تکذیب، اور اعراض و انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ (اس دنیا) کی محبت میں گرفتار ہو اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔

یہاں ضمناً ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید میں ”سَابِقُونَ“ اور ”سَابِقُونَ“ کے الفاظ بھی متعدد مقامات پر وارد ہوئے ہیں، جیسے سورہ آل عمران میں فرمایا: ﴿وَسَابِقُونَ إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ اور دوڑ لگاؤ اپنے رب کی مغفرت کی طرف!“ (آیت ۱۳۳) اسی طرح سورہ الحديد کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا: ﴿سَابِقُونَ إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ ”ایک دوسرے سے آگے نکلنا اپنے رب کی مغفرت کی طرف!“۔

”سَابِقُونَ“ اور ”سَابِقُونَ“ فعل کے صغے ہیں۔ سورہ المومنون کی آیت ۶۱ میں مومنین صادقین کے اوصاف کے ضمن میں یہ دونوں الفاظ خبریہ انداز میں فعل مضارع اور اسم فاعل کی صورت میں وارد ہوئے ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ يُسَابِقُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ﴾ ”یہی لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لئے تیز گام ہیں اور اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں“۔ ”سَرَعَ“ ”يَسْرَعُ“ سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے ”مَسَارَعَةُ“ اور مَسَاقِيسِ سے باب مفاعلہ ہی کا مصدر ہے ”مُسَابَقَةُ“ — اور یہ دونوں قریب المفہوم اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑ لگانا۔ البتہ مسارعت و مسابقت اپنے اساسی مفہوم کے اعتبار سے عجلت پسندی سے قدرے مختلف شے ہے۔ واضح رہے کہ مسارعت اور مسابقت کا جذبہ بھی طبع انسانی میں ولایت شدہ موجود ہے۔ چنانچہ ہر انسان دوسرے لوگوں سے آگے نکلنا اور بڑھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید مسارعت و مسابقت کے اس جذبہ کے رخ کو خیر کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ انسان کو تعلیم دیتا اور تلقین کرتا ہے کہ ”دنیا“ یعنی دنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی و کوشش کرنے کے بجائے تم بھلائیوں میں، نیکیوں میں، خیر میں، خدمت خلق میں، عبادات کی بجا آوری میں، دین کے احکام اور اس کے اوار و نواہی کی تعمیل میں، دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی سعی و جہد میں اور اقامت دین اور غلبہ دین کے لئے اتفاق مال اور

بذل نفس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ اللہ کی مغفرت اور جنت کے شاہ درے ہیں۔

البتہ ہر کام کے لئے مناسب تدریج بھی ضروری ہے اور اس کی جملہ شرائط کو پورا کرنے میں جو مناسب وقت لگنا چاہئے اس کے ضمن میں صبر کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔ جیسے اگر نماز کو بہت جلدی جلدی پڑھا جا رہا ہو تو حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایسی نماز ادا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدوی مسلمان نے مسجد نبویؐ میں آکر جلدی جلدی نماز پڑھ لی تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا : ((صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) ”دوبارہ نماز پڑھ“ اس لئے کہ تیری نماز ادا نہیں ہوئی۔“ لہذا نماز کے ہر رکن کا حق پورے سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ ادا کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ اسی طرح اگرچہ قرآن حکیم میں نماز جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ”جب نماز جمعہ کے لئے اذان ہو جائے تو اللہ کی یاد کے لئے دوڑو۔“ لیکن تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہاں سعی (فاسعوا) سے دوڑنا مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز کے لئے دوڑ کر آنے سے حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے، یہ وقار اور سکینت کے متافی ہے۔ لہذا یہاں سعی سے مراد لپکنا ہو گا۔ یعنی اپنے تمام کاموں سے ذہنی و عملی تعلق توڑ کر جمعہ کی نماز کے لئے لپکو اور ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اللہ کی جانب سے متن قرآن کی حفاظت

اور معانی قرآن کی وضاحت کی ضمانت

آیت ۱۶ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے جو بات فرمائی گئی یعنی آنحضورؐ کو اپنی زبان مبارک کو قرآن حکیم کے ساتھ تیزی کے ساتھ حرکت دینے سے کمال شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا، تو آپؐ کے اس طرز عمل کا ایک سبب تو وہ تھا جو جلی انداز میں بیان کر دیا گیا، یعنی آپؐ کی قرآن حکیم کے ساتھ غایت درجہ کی محبت اور اس کا حد درجہ

شوق، جس کے نتیجے میں آپؐ نازل شدہ آیات قرآنی کو جلد از جلد یاد کر لینا چاہتے تھے تاکہ مزید وحی نازل ہو۔ لیکن آیت ۷۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے وحی قرآنی کو یاد کرنے کے لئے تیزی سے زبان مبارک کو حرکت دینے اور اس طرح شدید مشقت برداشت کرنے کا ایک دوسرا سبب بھی تھا، اور وہ یہ کہ آپؐ چاہتے تھے کہ آپؐ وحی کے الفاظ کو اچھی طرح یاد کر لیں، مبادا اس کا کوئی حصہ آپؐ کی یادداشت میں محفوظ نہ رہے اور اس طرح قرآن مجید کا کوئی لفظ یا کوئی آیت ضائع ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ کی اس تشویش کو رفع کرنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ”یقیناً ہمارے ذمے ہے اس (قرآن) کو جمع کر دینا بھی اور اس کا پڑھنا (یا پڑھوانا) بھی!“

© tasaliojaraaid.com

یہ آیہ مبارکہ جمع و ترتیب قرآن اور حفاظت متن قرآن کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے کہ اگرچہ سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں بھی حفاظت قرآن کے ضمن میں اللہ کا پختہ وعدہ وارد ہوا ہے کہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ ”یقیناً ہم نے ہی اس نصیحت اور یاد دہانی کو نازل فرمایا ہے اور خود ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں“ لیکن یہ حقیقت باطنی تامل واضح ہو جاتی ہے کہ اس موضوع پر قرآن کا ذرۂ نام سورۃ القیامہ کی آیت ۷۱ ہی ہے، اس لئے کہ ایک تو اس میں حفاظت کی مزید وضاحت دو الفاظ کے ذریعے کی گئی یعنی ”جَمَعَهُ“ اور ”قُرْآنَهُ“ اور دوسرے اس میں جو حرف جار ”علی“ وارد ہوا ہے (عَلَيْنَا) اس کا لازمی نتیجہ ”وجوب“ ہے، یعنی جمع و ترتیب قرآن اور حفاظت متن قرآن کو اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، اور اگرچہ اہل سنت ایک کلامی اختلاف کے باعث اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کا ”وجوب“ تسلیم نہیں کرتے، لہذا اس مقام پر اس سے مراد ”وجوب“ نہیں بلکہ ”وعدہ“ لیتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا حاصل بھی وہی ہے، اس لئے کہ اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دوبارہ یہ ارشاد فرمایا کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ ”یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا!“ (آل عمران: ۹ اور الرعد: ۳۱) اور دو

© tasaliojaraaid.com

ہی بار یہ فرمایا کہ ”اللہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا اپنے وعدے کے!“ (البقرہ : ۸۰) اور
 الحج : ۷۷) گویا اللہ تعالیٰ اور قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کو قرآن مجید کے
 متن کی سالمیت اور محفوظیت کے معاملے میں ہرگز کبھی کسی قسم کا شک و شبہ لاحق نہیں
 ہو سکتا۔

جمع قرآن کے دو مراحل

اس آیہ مبارکہ میں جمع قرآن کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی جس ذمہ داری کا ذکر ہے
 اس کا اولین مصداق تو جمع مفسرین و محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ نے قرآن مجید کو نبی
 اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں جمع فرمادیا تھا۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس
 مرحلے کے ضمن میں مختلف النوع شہادت لاءلمی کے باعث بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں
 پائے جاتے ہیں۔

جمع قرآن کا یہ مرحلہ ثانی قرآن مجید کو ایک کتابی شکل میں جمع کرنے کا تھا جو بالا جماع
 نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد طے پایا، اس لئے کہ اس پر اتفاق ہے کہ ”مَایِینَ
 الدُّفَیْنِ“ (جلد کے دو گتوں کے درمیان) قرآن کا ایک کتاب کی صورت میں جمع ہو جانا
 آنحضورؐ کی حیات دنیوی کے دوران نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک قرآن جس طرح نبی
 اکرم ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع تھا اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد
 کے بھی صرف سینوں میں محفوظ تھا۔

اس مرحلہ ثانی کے بارے میں ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات تو وہ ہے جو خلیفہ
 ثالث ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ قافیہ کی مناسبت
 سے ”جَامِعُ آيَاتِ الْقُرْآنِ“ کے الفاظ چسپاں کر دینے کے باعث بہت بڑے حلقے میں پھیل
 گئی ہے، جس سے ذہنوں میں خواہ مخواہ یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید قرآن کتابی
 صورت میں نبی اکرم ﷺ کے وصال کے کم از کم پندرہ بیس سال بعد جمع ہوا، اور یہ
 وسوسہ منطقی طور پر بہت سے شکوک و شبہات کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے، جبکہ واقعہ

اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ مصحف کی صورت میں قرآن مجید کے جمع ہو جانے کا مرحلہ تو دور خلافت صدیق اکبر ؓ ہی میں گویا نبی اکرم ﷺ کی وفات کے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال کے اندر اندر طے پا گیا تھا۔ حضرت عثمان ؓ نے تو فی الواقع امت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا تھا۔ گویا اگر قافیہ کی رعایت ہی ملحوظ رہے تب بھی ان کی شان میں ”جامع الامة على القرآن“ کے الفاظ زیادہ موزوں بھی ہیں اور مطابق واقعہ بھی!

سورتوں اور آیات کی ترتیب

جمع قرآن کے ضمن میں دو سرا بڑا وسوسہ اور مغالطہ آیات اور سورتوں کی باہمی ترتیب سے متعلق ہے، جس کے ازالے کے لئے اولاً تو لفظ ”جَمْعُهُ“ ہی میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ یہ بدیہی امر ہے کہ قرآن کا جمع ہونا بغیر ترتیب کے ممکن نہیں ہے۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت و صراحت دوسرے لفظ یعنی ”قُرْآنُهُ“ کے ذریعے کر دی گئی، جس کا ترجمہ ”اس کا پڑھنا“ بھی کیا جاسکتا ہے اور ”پڑھوانا“ بھی۔ لیکن اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ ”قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر و توضیح کرتا ہے“ تو سورۃ الاعلیٰ کی آیت ۶ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى﴾ یعنی ”ہم عنقریب آپ کو پڑھوادیں گے تو آپ بھولیں گے نہیں“ کے مطابق یہاں بھی زیادہ موزوں ترجمہ ”پڑھوانا“ ہی ہو گا۔ چنانچہ اگلی آیت مبارکہ یعنی ﴿فَإِذَا قُرْآنُهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ ”تو جب ہم پڑھوائیں تو آپ اسی پڑھوانے کی پیروی کریں“ مزید دلالت کر رہی کہ یہاں زیادہ زور اور تاکید ترتیب قرآنی کے بارے میں ہے، اس لئے کہ اولاً پڑھوانا لامحالہ کسی ترتیب ہی کے ساتھ ممکن ہے اور ثانیاً نبی اکرم ﷺ کو اسی ترتیب کی پابندی اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

”قُرْآنُهُ“ میں جو ضمیر فاعلی جمع متکلم کے صیغہ میں موجود ہے اس کے بارے میں اگرچہ دو احتمالات موجود ہیں، یعنی ایک یہ کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور دوسرے یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہوں، لیکن ”فَمُحَمَّدٌ“ آیات قرآنی ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ ”جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اصلاً اللہ ہی کی اطاعت کی“ (النساء: ۸۰) اور ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”یقیناً جو لوگ (اے

نبیؐ) آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں“ (الفتح ۱۰) ان دونوں احتمالات سے معنی اور مراد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ گویا فی الحقیقت تو اس پڑھوانے کا فاعل حقیقی اللہ سبحانہ و تعالیٰ خود تھا، لیکن مجازاً آیا بالفعل یہ پڑھوانا حضرت جبرئیل علیہ السلام کا فعل تھا۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضورؐ ہر رمضان مبارک میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے اور اپنی حیات دنیوی کے آخری رمضان المبارک میں آپؐ نے پورے قرآن کا دو مرتبہ دور مکمل کیا، اور ظاہر ہے کہ نہ آپؐ کا یہ دورہ قرآن کسی ترتیب کے بغیر ممکن تھا، نہ ہی آپؐ کے صحابہؓ میں سے جو حضرات پورے قرآن کے حافظ تھے وہ بغیر کسی ترتیب کے

غرضیکہ عقلاً اور نقلاً ہر اعتبار سے یہ بات مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک خاص ترتیب سے نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ آنحضور ﷺ نے امت کو قرآن سکھایا اور یاد کرایا اور امانت خداوندی کو کامل دیانت کے ساتھ امت کے حوالے کر دیا، جیسے کہ آپؐ نے خطبہ جتہ الوداع میں ارشاد فرمایا ((تَوَكَّلْتُ فِيكُمْ مَا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ لَن تَضِلُّوا بَعْدَهُ كِتَابَ اللَّهِ)) ”میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، یعنی اللہ کی کتاب!“

غلط فہمی کا سبب

اس ضمن میں مغالطہ کا سبب یہ ظاہر و باہر اور متفق علیہ حقیقت ہے کہ قرآن کی ترتیب نزولی مصحف کی ترتیب سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن اگر ترتیب نزولی اور ترتیب مصحف کے فرق کی حکمت کو سمجھ لیا جائے تو شیطان کو کسی وسوسہ اندازی کا موقع نہیں مل سکتا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا وہ کلام قدیم ہے جو ازل سے ”لوح محفوظ“

میں درج ہے، اور یہ وہ ابدی ہدایت نامہ ہے جو تا قیام قیامت تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کفایت کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ

”نوعِ انسان را پیامِ آخرینِ حاملِ او رحمتِ للعالمین!“

اس کا نزول نبی اکرم ﷺ پر ایک خاص زمانے میں اور مخصوص حالات کے تناظر میں ہوا، اور یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ اس کی آیات بینات ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیات دنیوی کے دوران بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر اتنے معجزانہ طور پر چسپاں ہوتی چلی گئیں جیسا کہ وہ خاص ان ہی حالات کے لئے نازل ہوئی ہوں، اور اس طرح آنحضور ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی دعوت و تحریک کے جاں نسل حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے ضمن میں بروقت ہدایت و رہنمائی ملتی چلی گئی، جس سے آپ کے قلب مبارک کو بھی جماؤ اور ٹھہراؤ اور استقامت حاصل ہوتی چلی گئی اور آپ کے صحابہ کے دلوں کو بھی سہارا ملتا رہا اور ان کی ڈھارس بندھی رہی۔ چنانچہ یہی بات ہے جو سورۃ الفرقان کی آیت ۳۲ میں بیان ہوئی ہے کہ ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً﴾ اور کافروں نے کہا کہ ان پر قرآن ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے یہ اس لئے کیا کہ اس کے ذریعے (اے نبی) آپ کے دل کو جماؤ عطا فرمادیں، پس ہم نے اسے پڑھوایا تھوڑا تھوڑا کر کے!“

گویا ترتیب نزول کی اصل حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کی دعوت جن جن مراحل سے گزر رہی ہے اور آپ کی جدوجہد کو جن جن موانع سے سابقہ پیش آ رہا ہے ان کی مناسبت سے آیات قرآنیہ نازل ہوتی چلی جائیں تاکہ آپ کو بروقت رہنمائی ملے اور ہر مرحلے پر جو اعتراضات آپ پر کئے جائیں، یا جو سوالات و اشکالات آپ کے سامنے پیش کئے جائیں ان سب کا حل اور جواب ساتھ کے ساتھ ملتا چلا جائے، جبکہ ترتیب مصحف وقتی حالات کے تابع نہیں ہے بلکہ لوح محفوظ، یا کتاب مکنون، یا أم الكتاب کے عین مطابق و مطابق اصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات اور سورتوں کی اس

ازلی اور ابدی ترتیب میں غور و فکر کرنے والوں کو عظیم حکمتوں اور علوم و معارف کے نہ ختم ہونے والے خزانوں کا سراغ ملتا ہے اور اس سے علم و حکمت قرآنی کے نئے نئے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ ترتیب ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع فرمایا اور اسی کی پیروی اور پابندی کا آپ کے متبعین کو حکم دیا، اور یہی ترتیب اب ہمیشہ کے لئے دین میں حجت ہے!!

البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اُس وقت مرتب اور جمع کیا جب جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ صحابہؓ شہید ہو گئے اور اندیشہ ہوا کہ کہیں اس طرح نوع انسانی قرآن سے محروم نہ ہو جائے۔ چنانچہ آلِ حناجہؓ نے نبی اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک کے جملہ کتابتین وحی کو جمع کر کے اور حضرت زیدؓ بن ثابت کو اُن کا ناظم اور سربراہ بنا کر اس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیں۔ چنانچہ پورا قرآن کریم جو حفاظ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس کے بعض اجزاء اور مختلف سورتیں بعض صحابہؓ کے پاس تحریری شکل میں بھی موجود تھیں، ان سب کی مدد سے قرآن مجید کو ”بین الدُّفَین“ یعنی جلد کے دو گتوں کے درمیان کتابی شکل میں جمع کر لیا گیا۔

البتہ اس کے پڑھنے میں اہل عرب کے مختلف لہجے تھے۔ اُردو زبان کے بھی مختلف لہجے ہیں، چنانچہ لکھنؤی لہجہ اور ہے اور دہلی کا لہجہ اور، اسی طرح حیدر آبادی لہجہ جدا ہے اور بہاری لہجہ جدا، اور ابتداء لوگوں کی سہولت کے لئے انہیں قرآن مجید کو اپنے اپنے لہجوں میں پڑھنے کی اجازت تھی، لہذا مختلف لہجوں کا اثر قرآن کریم کی کتابت و قراءت میں بھی آ رہا تھا۔ چنانچہ اُمت پر یہ احسان عظیم حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا ہے کہ آپؓ نے اپنے دور خلافت میں اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا۔ گویا آنجنابؓ قرآن کریم کو جمع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُمت کو قرآن کی ایک کتابت پر جمع کرنے والے ہیں۔

الغرض سورۃ القیامہ کی یہ دو آیات ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ۱۰ ﴿فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ

قُرْآنَهُ﴾ ۱۱ یعنی ”اے نبی! ہم پر ہے اس کا جمع کرنا بھی اور اس کا پڑھنا بھی“ تو جب

ہم اسے پڑھوائیں تو آپؐ اس کو اسی ترتیب سے پڑھئے۔ ”حفاظت متن قرآن اور جمع و ترتیب قرآن کے ضمن میں قرآن کا ذرۂٴ سنم ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۹ میں فرمایا ﴿ثُمَّ اِنْ عَلَيْنَا نِازٌ﴾ ”پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کی تمہیں یعنی توضیح و تشریح“ — یہ بات بھی نہایت اہم ہے، اور جس طرح جمع قرآن کے دو مرحلے تھے، اسی طرح اس کے بھی دو حصے ہیں، جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ چنانچہ ایک حصہ تو یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں نازل شدہ احکام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے تھے تو بعد میں توضیحی آیات نازل ہو جاتی تھیں، ایسی آیات بعض اوقات تو اسی حکم کے ساتھ متصلاً درج کر دی گئی ہیں، بعض اوقات انہیں کسی قدر فصل کے ساتھ درج کیا گیا ہے، اور بعض اوقات سورۃ کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ رمضان کے روزوں کے بارے میں تفصیلی احکام پر مشتمل آیت سورۃ البقرہ کے اسی تیسویں رکوع کے آخر میں شامل کر دی گئی جس میں ابتدائی حکم درج ہے، جبکہ دوسری اور تیسری صورتوں کی نمایاں مثالیں سورۃ النساء میں موجود ہیں۔ ایسی توضیحی آیات کے ساتھ آپؐ اکثر دیکھیں گے کہ یہ الفاظ آتے ہیں ﴿كَذٰلِكَ يَبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ﴾ ”اسی طرح اللہ اپنی آیات کی تمہیں اور وضاحت فرمادیتا ہے۔“

الغرض ایک تو تمہیں قرآن یعنی قرآن مجید کی مزید تشریح و توضیح کی صورت یہ ہے کہ وہ خود قرآن ہی کے ذریعے ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک دوسرا نظام بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرض منصبی قرار دیا گیا کہ آپؐ قرآن مجید کی تشریح و توضیح اور تمہیں فرمائیں، چنانچہ سورۃ النحل کی آیت ۴۴ میں فرمایا : ﴿وَ اَنۡزَلۡنَا اِلَيْكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ اِلَيْهِمْ﴾ ”(اے نبی ﷺ) ہم نے آپؐ پر یہ الذکر (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے لئے وضاحت کریں اس چیز کی جو ان کے لئے نازل کی گئی ہے“ — گویا قرآن مجید کی توضیح و تمہیں کی ایک صورت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت خصوصی یا وحی خفیہ پر مبنی سنت رسولؐ کے ذریعے سامنے آئی۔ اس سلسلے میں کچھ کج فہم اور گم کردہ راہ لوگوں کا یہ اشکال بالکل بے بنیاد ہے کہ اگر قرآن پر سنت رسولؐ کا اضافہ کیا جائے تو یہ قرآن کی توہین ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن

مکمل نہیں ہے اور وہ اپنی وضاحت کے لئے سنت کا محتاج ہے۔ معاذ اللہ، کوئی صاحب ایمان قرآن کے متعلق ہرگز یہ تصور اور خیال نہیں رکھتا کہ قرآن سنت کا محتاج ہے، البتہ تمام مسلمانوں کا اجماعی و متفق علیہ موقف یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کی رہنمائی پر عمل پیرا ہونے کے لئے سنت رسولؐ کے محتاج ہیں۔ گویا یہ احتیاج ہماری ہے کہ ہم قسم قرآن اور عمل بالقرآن کے لئے نبی اکرم ﷺ کے اقوال اور افعال مبارکہ کو اپنے سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید پر کس طرح عمل کر کے دکھایا ہے اور تعلیمات قرآن کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں کس طرح بالفعل کیا اور اس طرح اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس لئے کہ اسی کے حوالے سے ہم قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھ بھی سکیں گے اور اس پر عمل بھی کر سکیں گے، اور سنت کی یہ بنیاد بھی حکماء ہدایت قرآن ہی کا حصہ ہوگی، اس لئے بھی کہ اس تینیں قرآن کا حکم اللہ ہی نے آپؐ کو دیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعدد کاموں کو صراحتاً اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، جس کی ایک نمایاں مثال سورۃ الانفال میں وارد ہوئی ہے کہ غزوہ بدر میں نبی اکرم ﷺ نے کنکریوں کی مٹی بھر کر کفار کی طرف پھینکی تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا زَمِنْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی﴾ (اے نبی!) جب آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو آپؐ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں تعبیر کیا ہے۔

گفتہ اُو گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

الغرض۔۔۔ معانی و مطالب قرآن کی وضاحت کا ذمہ بھی از روئے آیہ مبارکہ اللہ نے خود لیا تھا۔۔۔ جو کچھ تو خود قرآن حکیم کی توضیحی آیات کے ذریعے پورا ہوا اور اکثر و بیشتر سنت رسول ﷺ کے ذریعے پورا ہوا۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِى الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ ۚ وَتَفَعَّلْنٰ بِآيَاتِهِ وَالَّذِيْ خَرِ الْحَكِيْمِ ۝۝